فیصلہ کن سوال

ہندوستان میں اور دوسرے مشرقی ممالک میں جو لوگ پردے کی مخالفت کرتے ہیں ان کے سامنے در اصل زندگی کا یہی نقشہ ہے۔ اسی زندگی کے تابناک مظاہر نے انکے حواس کو متاثر کیا ہے۔ یہی نظریات، یہی اخلاقی اصول، اور یہی مادّی و جسمی فوائد و لذائذ ہیں جنکے روشن پہلو نے ان کے دل و دماغ کو اپیل کیا ہے۔ پردہ سے انکی نفرت اسی بنا پر ہے کہ اُسکا بنیادی فلسفۂ اخلاق اس مغربی فلسفۂ اخلاق کی ضد ہے جس پر یہ ایمان لائے ہیں، اور عملاً اُن فائدوں اور لذتوں کے حصول میں مانع ہے جنکو ان حضرات نے مقصود بنایا ہے۔ اب یہ سوال کہ اس نقشۂ زندگی کے تاریک پہلو، یعنی اسکے عملی نتائج کو بھی یہ لوگ قبول کرنے کے لیے تیار ہیں یا نہیں، تو اس باب میں انکے درمیان اتفاق نہیں ہے۔ ایک گروہ ان نتائج کو جانتا ہے اور انہیں قبول کرنے کے لیے تیار ہے۔ درحقیقت اسکے نزدیک یہ بھی مغربی زندگی کا روشن پہلو ہی ہے نہ کہ تاریک۔ دوسرا گروہ اس پہلو کو تاریک سمجھتا ہے، ان نتائج کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے، مگر ان فائدوں کا بُری طرح فریفتہ ہے جو اس طرزِ زندگی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ تیسرا گروہ نہ تو نظریات ہی کو سمجھتا ہے، نہ انکے نتائج سے واقف ہے، اور نہ اس بات پر غور و فکر کی زحمت اٹھانا چاہتا ہے کہ ان نظریات اور ان نتائج کے درمیان کیا تعلق ہے۔ اسکو تو بس وہ کام کرنا ہے جو دنیا میں ہو رہا ہے ——— یہ تینوں گروہ باہم کچھ اس طرح مخلوط ہو گئے ہیں کہ گفتگو کے وقت بسا اوقات یہ تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ہمارا مخاطب در اصل کس گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی اختلاط کی وجہ سے عموماً سخت غلط مبحث پیش آتا ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ انکو چھانٹ کر ایک دوسرے سے الگ کیا جائے اور ہر ایک سے اس کی حیثیت کے

مطابق بات کی جائے۔

مشرقی مستغربین پہلے گروہ کے لوگ اس فلسفہ اور ان نظریات پر، اور ان تمدنی اصولوں پر علی وجہ البصیرت ایمان لائے ہیں جن پر مغربی تہذیب و تمدن کی بنا رکھی گئی ہے۔ وہ اسی دماغ سے سوچتے ہیں، اور اسی نظر سے زندگی کے مسائل کو دیکھتے ہیں جس سے جدید یورپ کے معماروں نے دیکھا اور سوچا تھا۔ اور وہ خود اپنے اپنے ملکوں کی تمدنی زندگی کو بھی اسی مغربی نقشہ پر تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ عورت کی تعلیم کا منتہائے مقصود ان کے نزدیک واقعی یہی ہے کہ وہ کمانے کی قابلیت بہم پہنچائے، اور اس کے ساتھ دل لبھانے کے فنون سے بھی کماحقہٗ واقف ہو۔ خاندان میں عورت کی صحیح حیثیت ان کے نزدیک درحقیقت یہی ہے کہ وہ مرد کی طرح خاندان کا کمانے والا رکن بنے اور مشترک بجٹ میں اپنا حصہ پورا پورا ادا کرے۔ سوسائیٹی میں عورت کا اصلی مقام ان کی رائے میں یہی ہے کہ وہ اپنے حسن، اپنی آرائش اور اپنی اداؤں سے اجتماعی زندگی میں ایک عنصر لطیف کا اضافہ کرے، اپنی خوش گفتاری سے دلوں میں حرارت پیدا کرے، اپنی موسیقی سے کانوں میں رس بھر دے، اپنے رقص سے روحوں کو وجد میں لائے اور تھرک تھرک کر اپنے جسم کی ساری خوبیاں آدم کے بیٹوں کو دکھائے تاکہ انکے دل خوش ہوں، انکی نگاہیں لذت یاب ہوں، اور انکے ٹھنڈے خون میں تھوڑی سی گرمی آجائے۔ حیات قومی میں عورت کا کام انکے خیال میں فی الواقع اسکے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ سوشل ورک کرتی پھرے، میونسپلٹیوں اور کونسلوں میں جائے، کانفرنسوں اور کانگریسوں میں شریک ہو، سیاسی اور تمدنی اور معاشرتی مسائل کو سلجھانے میں اپنا وقت اور دماغ صرف کرے، اور رزشوں اور کھیلوں میں حصہ لے، تیراکی اور دوڑ اور کود پھاند اور لمبی لمبی اڑانوں کے ریکارڈ توڑے، غرض وہ سب کچھ کرے جو گھر سے باہر ہے اور اس سے کچھ غرض نہ رکھے جو گھر کے اندر ہے۔ اس زندگی کو وہ آئیڈیل زندگی سمجھتے ہیں۔ انکے نزدیک دنیوی ترقی کا یہی ایک راستہ ہے اور اس راستہ پر جانے میں جتنے پرانے اخلاقی نظریات مانع ہیں وہ سب کے سب محض لغو اور سراسر باطل ہیں۔ اس نئی زندگی کے لیے پرانی اخلاقی قدروں

(Moral values) کو انہوں نے اسی طرح نئی قدروں سے بدل لیا ہے جس طرح یورپ نے بدلا ہے مادّی فوائد اور جسمانی لذتیں انکی نگاہ میں زیادہ بلکہ اصلی قدر و قیمت رکھتی ہیں، اور انکے مقابلہ میں حیا، عصمت، طہارتِ اخلاق، ازدواجی زندگی کی وفاداری، نسب کی حفاظت، اور اسی قبیل کی دوسری تمام چیزیں نہ صرف یہ کہ بے قدر ہیں، بلکہ دقیانوسی تاریک خیالی کے ڈھکوسلے ہیں جنہیں ختم کیے بغیر ترقی کا قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔

یہ لوگ دراصل دینِ مغربی کے سچے مومن ہیں اور جس نظریہ پر یہ ایمان لائے ہیں اس کو اُن تمام تدبیروں سے، جو یورپ میں اس سے پہلے اختیار کی جا چکی ہیں، مشرقی ممالک میں پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

نیا ادب | سب سے پہلے ان کے لٹریچر کو لیجیے جو دماغوں کو تیار کرنے والی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اس نام نہاد ادب ــــ دراصل بے ادبی ــــ میں پوری کوشش اس امر کی کی جا رہی ہے کہ نئی نسلوں کے سامنے اس نئے اخلاقی فلسفہ کو مزین بنا کر پیش کیا جائے اور پرانی اخلاقی قدروں کو دل و دماغ کے ایک ایک ریشے سے کھینچ کر نکال ڈالا جائے۔ مثال کے طور پر میں یہاں اردو کے نئے ادب سے چند نمونے پیش کرونگا۔

ہندوستان کے ایک مشہور ماہ نامے میں، جسکو ادبی حیثیت سے اس ملک میں کافی وقعت حاصل ہے، ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "شیریں کا سبق"۔ صاحب مضمون ایک ایسے صاحب ہیں جو اعلیٰ تعلیم یافتہ، ادبی حلقوں میں مشہور اور ایک بڑے عہدے پر فائز ہیں۔ مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک نوجوان صاحبزادی اپنے اُستاد سے سبق پڑھنے بیٹھی ہیں اور درس کے دوران میں اپنے ایک نوجوان دوست کا نامۂ محبت اُستاد کے سامنے بغرض مطالعہ و مشورہ پیش فرماتی ہیں۔ اس "دوست" سے انکی ملاقات کسی چائے پارٹی میں ہو گئی تھی۔ وہاں کسی لیڈی نے تعارف کی رسم ادا کر دی"۔ اس دن سے میل جول اور مراسلت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اب صاحبزادی یہ چاہتی ہیں کہ اُستاد جی انکو اس دوست کے محبت ناموں کا "اخلاقی جواب" لکھنا سکھا

دیں۔ اُستاد کوشش کرتا ہے کہ لڑکی کو ان بیہودگیوں سے ہٹا کر پڑھنے کی طرف راغب کرے۔ لڑکی جواب دیتی ہے کہ:

"پڑھنا تو میں چاہتی ہوں مگر ایسا پڑھنا جو میرے جاگتے کے خوابوں کی آرزوؤں میں کامیاب ہونے میں مدد دے۔ نہ ایسا پڑھنا کہ مجھ ابھی سے بڑھیا بنا دے۔"

استاد پوچھتا ہے "کیا ان حضرت کے علاوہ تمہارے اور بھی کچھ نوجوان دوست ہیں؟" لائق شاگرد جواب دیتی ہے "کئی ہیں مگر اس نوجوان میں یہ خصوصیت ہے کہ بڑے مزے سے جھڑک دیتا ہے۔" استاد کہتا ہے کہ اگر تمہارے ابا کو تمہاری اس خط و کتابت کا پتہ چل جائے تو کیا ہو؟ صاحبزادی جواب دیتی ہیں:

"کیا ابا نے شباب میں اس قسم کے خط نہ لکھے ہونگے؟ اچھے خاصے فیشن ایبل ہیں۔ کیا تعجب ہے کہ اب بھی لکھتے ہوں۔ خدانخواستہ بوڑھے نہیں ہو گئے ہیں۔"

استاد کہتا ہے کہ "آج سے پچاس برس پہلے تو یہ خیال بھی ناممکن تھا کہ کسی شریف زادی کو محبت کا خط لکھا جائے۔" شریف زادی صاحبہ جواب میں فرماتی ہیں:

"تو کیا اس زمانہ کے لوگ صرف بدذاتوں سے ہی محبت کرتے تھے۔ بڑے مزے میں تھے اس زمانے کے بدذات اور بڑے بدمعاش تھے اس زمانہ کے شریف۔"

"شیریں" کے آخری الفاظ، جن پر مضمون نگار نے گویا اپنے ادیبانہ تفلسف کی تان توڑی ہے، یہ ہیں:

"ہم لوگوں (یعنی نوجوانوں) کی دُہری ذمہ داری ہے۔ وہ مسرتیں جو ہمارے بزرگ کھو چکے زندہ کریں، اور وہ غصہ اور جھوٹ کی عادتیں جو زندہ ہیں انہیں دفن کریں۔"

ایک اور نامور ادبی رسالہ میں اب سے ڈیڑھ دو سال پہلے ایک مختصر افسانہ "پشیمانی" کے عنوان سے شائع ہوا تھا جس کا خلاصہ سیدھے سادے الفاظ میں یہ تھا کہ ایک شریف خاندان کی بن بیاہی لڑکی ایک شخص سے آنکھ

لڑاتی ہے۔ اپنے باپ کی غیر موجودگی اور ماں کی لاعلمی میں اسکو چپکے سے بلا لیتی ہے۔ ناجائز تعلقات کے نتیجہ میں حمل قرار پا جاتا ہے۔ اسکے بعد وہ اپنے اس ناپاک فعل کو حق بجانب ٹھیرانے کے لیے دل ہی دل میں یوں استدلال کرتی ہے:

"میں پریشان کیوں ہوں؟ میرا دل دھڑکتا کیوں ہے؟ .... کیا میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا ہے؟ کیا میں اپنی کمزوری پر نادم ہوں؟ شاید ہاں۔ لیکن اُس رومانی چاندنی رات کی داستان تو میری کتاب زندگی میں سنہری الفاظ سے لکھی ہوئی ہے۔ شباب کے مست لمحات کی اس یاد کو تو اب بھی میں اپنا سب سے زیادہ عزیز خزانہ سمجھتی ہوں۔ کیا میں ان لمحات کو واپس لانے کے لیے اپنا سب کچھ دینے کے لیے تیار نہیں؟ ......

"پھر کیوں میرا دل دھڑکتا ہے؟ کیا گناہ کے خوف سے؟ کیا میں نے گناہ کیا؟ نہیں میں نے گناہ نہیں کیا۔ میں نے کس کا گناہ کیا؟ میرے گناہ سے کس کو نقصان پہنچا؟ میں نے تو قربانی کی۔ قربانی اُس کے لیے، کاش کہ میں اسکے لیے اور بھی قربانی کرتی! گناہ سے میں نہیں ڈرتی۔ لیکن ہاں شاید میں اس چڑیل سوسائٹی سے ڈرتی ہوں۔ اس کی کیسی کیسی معنی خیز اشتباہ آمیز نظریں مجھ پر پڑتی ہیں ......

"آخر میں اس سے کیوں ڈرتی ہوں؟ اپنے گناہ کے باعث؟ لیکن میرا گناہ ہی کیا ہے؟ کیا جیسا میں نے کیا ویسا ہی سوسائٹی کی کوئی اور لڑکی نہ کرتی؟ وہ سہانی رات اور وہ تنہائی۔ وہ کتنا خوبصورت تھا۔ اس نے کیسے میرے منہ پر اپنا منہ رکھ دیا۔ اور اپنی آغوش میں مجھے کھینچ لیا، بھینچ لیا۔ اُف اس کے گرم اور خوشبودار سینے سے میں کس اطمینان سے چمٹ گئی۔ میں نے ساری دنیا ٹھکرا دی اور اپنا سب کچھ ان چند لمحاتِ عیش پر بیچ دیا۔ پھر کیا ہوا؟ کوئی اور کیا کرتا؟ کیا دنیا کی کوئی عورت اس وقت اس کو ٹھکرا سکتی تھی؟ ......

"گناہ؟ میں نے ہرگز گناہ نہیں کیا۔ میں ہرگز نادم نہیں ہوں۔ میں پھر وہی کرنے کو تیار ہوں ..... عصمت؟ عصمت ہے کیا؟ حرف کنوارپن؟ یا خیالات کی پاکیزگی؟ میں کنواری نہیں رہی، لیکن کیا میں نے اپنی عصمت کھو دی؟ ....

"فسادی چڑیل سوسائیٹی کو جو کچھ کرنا ہو کرے۔ وہ میرا کیا کر سکتی ہے؟ کچھ نہیں۔ میں اسکی پُر حماقت انگشت نمائی سے کیوں جھینپوں؟ میں اسکی کانا پھوسی سے کیوں ڈروں؟ کیوں اپنا چہرہ زرد کر لوں؟ میں اسکے بے معنی تمسخر سے کیوں منہ چھپاؤں؟ میرا دل کہتا ہے کہ میں نے ٹھیک کیا، اچھا کیا، خوب کیا۔ پھر میں کیوں چور بنوں؟ کیوں نہ ببانگ دہل اعلان کر دوں کہ میں نے ایسا کیا اور خوب کیا؟"

یہ طرزِ استدلال اور یہ طرزِ فکر ہے جو ہمارا نئے زمانہ کا ادیب ہر لڑکی ـــــ شائد خود اپنی بہن اور بیٹی کو بھی ـــــ سکھانا چاہتا ہے۔ اسکی تعلیم یہ ہے کہ ایک جوان لڑکی کو چاندنی رات میں جو گرم سینہ بھی مل جائے اس سے اسکو چمٹ جانا چاہیے کیونکہ اس صورت حال میں یہی ایک طریق کار ممکن ہے، اور جو عورت بھی ایسی حالت میں ہو وہ اسکے سوا کچھ کر ہی نہیں سکتی۔ یہ فعل گناہ نہیں بلکہ "قربانی" ہے۔ اور اس سے عصمت پر بھی کوئی حرف نہیں آتا۔ بھلا خیالات کی پاکیزگی کے ساتھ کنوارپن کو قربان کر دینے سے بھی کہیں عصمت جاتی ہو گی! اس سے تو عصمت میں اور اضافہ ہوتا ہے۔ بلکہ یہ ایک ایسا شاندار کارنامہ ہے کہ ایک عورت کی زندگی میں اسے سنہری الفاظ سے لکھا جانا چاہیے، اور اُسکی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اُسکی ساری کتاب زندگی ایسے ہی سنہرے الفاظ میں لکھی ہوئی ہو۔ رہی سوسائیٹی، تو وہ اگر ایسی عصمت مآب خواتین پر حرف رکھتی ہے تو وہ فسادی اور چڑیل ہے۔ قصوروار وہ خود ہے کہ ایسی ایثار پیشہ لڑکیوں پر حرف رکھتی ہے، نہ کہ وہ صاحبزادی جو ایک رومانی رات میں کسی کھلی ہوئی آغوش کے اندر بھینچے جانے سے انکار نہ فرمائیں۔ ایسی ظالم سوسائیٹی جو اتنے اچھے کام کو برا کہتی ہے، ہرگز اسکی مستحق نہیں کہ اس سے ڈرا جائے، اور یہ کارِ خیر انجام دے کر اس سے

منہ چھپایا جائے۔ نہیں، ہر لڑکی کو علانیہ اور بیباکانہ اس فضیلت اخلاق کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور خود شرمندہ ہونے کے بجائے، ہو سکے تو الٹا سوسائیٹی کو شرمندہ کرنا چاہیے ——— یہ جرأت و جسارت کبھی بازار میں بیٹھنے والی بیسواؤں کو بھی نصیب نہ تھی، کیونکہ اُن بدنصیبوں کے پاس ایسا فلسفۂ اخلاق نہ تھا جو گناہ کو صواب اور صواب کو گناہ کر دیتا۔ اُس وقت کی بیسوا عصمت تو بیچتی تھی مگر اپنے آپ کو خود ذلیل اور گناہگار سمجھتی تھی۔ مگر اب یہ نیا ادب ہر گھر کی بہو اور بیٹی کو پہلے زمانہ کی بیسواؤں سے بھی دس قدم آگے پہنچا دینا چاہتا ہے کیونکہ یہ بدمعاشی و فحش کاری کی پشتیبانی کے لیے ایک نیا فلسفۂ اخلاق پیدا کر رہا ہے۔

ایک اور رسالہ میں، جسکو ہمارے ملک کے ادبی حلقوں میں کافی مقبولیت حاصل ہے، ایک افسانہ "دیور" کے عنوان سے شائع ہوا ہے ——— مصنف ایک ایسے صاحب ہیں جنکے والد مرحوم کو عورتوں کے لیے بہترین اخلاقی لٹریچر پیدا کرنے کا شرف حاصل تھا، اور اسی خدمت کی وجہ سے غالباً وہ ہندوستان کی اردو خواں عورتوں میں مقبول ترین بزرگ تھے ——— اس افسانہ میں نوجوان ادیب صاحب ایک ایسی لڑکی کے کیرکٹر کو خوشنما بنا کر اپنی بہنوں کے لیے نمونہ کے طور پر پیش فرماتے ہیں جو شادی سے پہلے ہی اپنے "دیور کی بھرپور جوانی اور شباب کے ہنگاموں" کا خیال کر کے "اپنے جسم میں تھرتھری" پیدا کر لیا کرتی تھی، اور کنوارپنے ہی میں جس کا مستقل نظریہ یہ تھا کہ "جو جوانی خاموش اور پرسکون گذر جائے اُس میں اور ضعیفی میں کوئی فرق نہیں میرے نزدیک تو جوانی کے لیے ہنگامے ضروری ہیں جنکا ماخذ کشمکش حسن و عشق ہے"۔ اس نظریہ اور ان ارادوں کو لیے ہوئے جب یہ صاحبزادی بیاہی گئیں تو اپنے ڈاڑھی والے شوہر کو دیکھ کر ان کے جذبات پر "اوس پڑ گئی" اور انہوں نے پہلے سے سوچے ہوئے نقشے کے مطابق فیصلہ کر لیا کہ اپنے شوہر کے حقیقی بھائی سے دل لگائینگی۔ چنانچہ بہت جلدی اسکا موقع آگیا۔ شوہر صاحب حصول تعلیم کے لیے ولایت چلے گئے اور انکے پیچھے بیوی نے شوہر کی اور بھائی نے بھائی کی خوب دل کھول کر اور مزے لے لے کر خیانت کی۔ مصنف نے اس کارنامے کو خود اُس مجرمہ کے قلم سے لکھا ہے۔ وہ اپنی ایک سہیلی کو جسکی ابھی شادی نہیں

ہوئی ہے، اپنے تمام کرتوت آپ اپنے قلم سے لکھ کر بھیجتی ہے، اور وہ تمام مراحل پوری تفصیل کے ساتھ بیان کرتی ہے جن سے دیو راور بھاوج کی یہ آشنائی گذر کر آخری مرحلہ تک پہنچی۔ قلب اور جسم کی جتنی کیفیات صنفی اختلاط کی حالت میں واقع ہوسکتی ہیں ان میں سے کسی ایک کو بھی بیان کرنے سے وہ نہیں چوکتی۔ بس اتنی کسر رہ گئی ہے کہ فعل مباشرت کی تصویر نہیں کھینچی گئی۔ شائد اس کوتاہی میں بھی یہ بات مدنظر ہوگی کہ ناظرین وناظرات کا تخیل تھوڑی سی زحمت اٹھا کر خود ہی اسکی خانہ پُری کرلے!

اس نئے ادب کا اگر فرانس کے اُس ادب سے مقابلہ کیا جائے جسکے چند نمونے ہم نے اس سے پہلے پیش کیے ہیں تو صاف نظر آجائیگا کہ یہ قافلہ اُسی راستے سے اُسی منزل کی طرف جارہا ہے۔ اسی نظام زندگی کے لیے ذہنوں کو نظری اور اخلاقی حیثیت سے تیار کیا جارہا ہے، اور عنانِ توجہ خاص طور پر عورتوں کی طرف منعطف ہے تاکہ انکے اندر حیا کی ایک رمق بھی باقی نہ چھوڑی جائے۔

تمدن جدید یہ فلسفۂ اخلاق اور یہ نظریۂ زندگی میدان میں اکیلا نہیں ہے۔ اسکے ساتھ ساتھ سرمایہ دارانہ نظام تمدن، اور مغربی جمہوریت کے اصول بھی برسرِکار آگئے ہیں، اور یہ تینوں طاقتیں مل جُل کر زندگی کا وہی نقشہ بنا رہی ہیں جو مغرب میں بن چکا ہے۔ صنفیات پر بدترین قسم کا فحش لٹریچر شائع کیا جارہا ہے جو مدرسوں اور کالجوں کے طالبین وطالبات تک کثرت سے پہنچتا ہے۔ عریاں تصویریں اور آبرو باختہ عورتوں کی شبیہیں ہر اخبار، ہر رسالے، ہر گھر اور ہر دوکان کی زینت بن رہی ہیں۔ گھر گھر اور بازار بازار گراموفون کے وہ ریکارڈ بج رہے ہیں جن میں نہایت رکیک اور گندے گیت بھرے جاتے ہیں۔ سینما کا سارا کاروبار جذبات شہوانی کی انگیخت پر چل رہا ہے، اور پردۂ سیمیں پر فحش کاری وبے حیائی کو ہر شام اتنا مزین بنا کر پیش کیا جاتا ہے کہ ہر لڑکی اور لڑکے کی نگاہ میں ایکٹروں اور ایکٹریسوں کی زندگی اسوۂ حسنہ بن کر رہ جاتی ہے۔ ان شوق پرور وتمنا آفریں کھیلوں کو دیکھ کر دونوں صنفوں کے نوجوان جب تماشا گاہ سے نکلتے ہیں تو انکے بے چین ولولے ہر طرف عشق اور رومان کے مواقع ڈھونڈھنے لگتے ہیں

یہ سب سرمایہ دارانہ انتفاع کی مختلف شکلیں ہیں۔ اسی سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کی بدولت بڑے شہروں میں وہ حالات تیزی کے ساتھ پیدا ہوتے چلے جا رہے ہیں جن میں عورتوں کے لیے اپنی روزی آپ کمانا ناگزیر ہوتا جاتا ہے۔ اور اسی ظالمانہ نظام کی مدد پر منعِ حمل کا پروپیگنڈا، اپنی دواؤں اور اپنے آلات کے ساتھ میدان میں آگیا ہے۔

جدید جمہوری نظام نے جس کی برکات زیادہ تر انگلستان اور فرانس کے توسط سے مشرقی ممالک تک پہنچی ہیں، ایک طرف عورتوں کے لیے سیاسی اور اجتماعی سرگرمیوں کے راستے کھول دیے ہیں، دوسری طرف ایسے ادارات قائم کیے ہیں جن میں عورتوں اور مردوں کے خلط ملط ہونے کی صورتیں لازماً پیدا ہوتی ہیں، اور تیسری طرف قانون کی بندشیں اتنی ڈھیلی کر دی ہیں کہ فواحش کا اظہار ہی نہیں بلکہ عملی ارتکاب بھی اکثر و بیشتر حالات میں جرم نہیں ہے۔

ان حالات میں جو لوگ پورے انشراحِ قلب کے ساتھ زندگی کے اس راستے پر جانے کا فیصلہ کر چکے ہیں، اُن کے اخلاقیات اور ان کی معاشرت میں قریب قریب مکمل انقلاب واقع ہو گیا ہے۔ ان کی خواتین اب ایسے لباسوں میں نکل رہی ہیں کہ ہر عورت پر فلم ایکٹریس کا دھوکا ہوتا ہے۔ ان کے اندر پوری بیباکی پائی جاتی ہے، بلکہ لباس کی عریانی، رنگوں کی شوخی، بناؤ سنگھار کے اہتمام، اور ایک ایک ادا سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ صنفی مقناطیس بننے کے سوا کوئی دوسرا مقصد ان خواتین کے پیشِ نظر نہیں ہے۔ حیا کا عالم یہ ہے کہ غسل کا لباس پہن کر مردوں کے ساتھ نہانا حتیٰ کہ اس حالت میں اپنے فوٹو کھنچوانا اور اخبارات میں شائع کرا دینا بھی اس طبقہ کی کسی شریف خاتون کے لیے موجبِ شرم نہیں ہے۔ بلکہ شرم کا سوال وہاں سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔ جدید اخلاقی تصورات کے لحاظ سے انسانی جسم کے سب حصے یکساں ہیں۔ اگر ہاتھ کی ہتھیلی اور پاؤں کے تلوے کو کھولا جا سکتا ہے تو آخر کیوں ران اور بنِ پستان کو کھول دینے میں کیا مضائقہ ہے؟ زندگی کا لطف، جس کے مظاہر کا مجموعی نام آرٹ ہے، ان لوگوں کے نزدیک ہر اخلاقی قید سے بالاتر بلکہ بجائے خود معیارِ اخلاق ہے۔ اسی بنا پر باپ اور بھائی اُس وقت فخر و مسرت کے مارے پھولے نہیں سماتے جب ان کی آنکھوں کے سامنے کنواری بیٹی اور بہن اسٹیج پر موسیقی اور رقص اور معشوقانہ اداکاری کے کمالات دکھا کر سینکڑوں پرجوش ناظرین و سامعین سے دادِ تحسین حاصل کرتی ہے۔ مادی کامیابی جس کا دوسرا نام مقصدِ زندگی ہے، ان کی رائے میں ہر اس ممکن چیز سے زیادہ قیمتی ہے جسے قربان کر کے یہ شے حاصل کی جا سکتی ہو۔

جس لڑکی نے اس گوہرِ مقصود کے حصول کی قابلیت اور سوسائیٹی میں مقبول ہونے کی لیاقت بہم پہنچالی اُس نے اگر عصمت کھوئی تو گویا کچھ بھی نہ کھویا، بلکہ سب کچھ پالیا۔ اسی بنا پر یہ بات کسی طرح انکی سمجھ میں آتی ہی نہیں کہ کسی لڑکی کا لڑکوں کیساتھ مدرسے یا کالج میں پڑھنا، یا عالمِ جوانی میں تنہا حصولِ تعلیم کے لیے یورپ جانا آخر کیوں قابلِ اعتراض ہو۔

مستغربین سے فیصلہ یہ ہیں وہ لوگ جو پردے پر سب سے بڑھ کر اعتراض کرتے ہیں۔ انکے نزدیک پردہ ایسی ایک حقیر بلکہ بدنما چیز ہے کہ اسکی تضحیک کردینا اور اس پر پھبتیاں کس دینا ہی اسکی تردید کے لیے کافی دلیل ہے۔ لیکن ان کا یہ رویہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص انسانی چہرے پر سرے سے ناک کی ضرورت ہی کا قائل نہ ہو، اور اس بنا پر وہ ہر اس شخص کا مذاق اڑانا شروع کردے جسکے چہرے پر اسے ناک نظر آئے۔ اس قسم کی جاہلانہ باتوں سے صرف جاہل ہی مرعوب ہوسکتے ہیں۔ انکو، اگر انکے اندر کوئی معقولیت موجود ہے، یہ سمجھنا چاہیے کہ ہمارے اور انکے درمیان دراصل قدروں کا بنیادی اختلاف ہے۔ جن چیزوں کو ہم قیمتی سمجھتے ہیں وہ ان کے نزدیک بے قیمت ہیں، لہٰذا اپنے معیارِ قدر کے لحاظ سے جس طرزِ عمل کو ہم ضروری سمجھتے ہیں وہ لامحالہ انکی نگاہ میں قطعاً غیر ضروری بلکہ مہمل ٹھیرنا ہی چاہیے۔ مگر ایسے بنیادی اختلاف کی صورت میں وہ صرف ایک خفیف العقل آدمی ہی ہوسکتا ہے جو اصل بنائے اختلاف پر گفتگو کرنے کے بجائے فروع پر حملہ شروع کردے۔

انسانی قدروں کے تعین میں فیصلہ کن چیز اگر کوئی ہے تو وہ قوانین فطرت ہیں۔ قوانین فطرت کے لحاظ سے انسان کی ساخت جس چیز کی مقتضی ہو، اور جس چیز میں انسان کی صلاح اور فلاح ہو، وہی دراصل قدر کی مستحق ہے۔ آؤ، اس معیار پر جانچ کر دیکھ لیں کہ قدروں کے اختلاف میں ہم راستی پر ہیں یا تم ہو۔ علمی دلائل جو کچھ تمہارے پاس ہیں انہیں لے آؤ، اور جو دلائل ہم رکھتے ہیں، انہیں ہم پیش کرتے ہیں۔ پھر راستباز اور ذی عقل انسانوں کی طرح دیکھو کہ وزن کس طرف ہے۔ اس طریقہ سے اگر ہم اپنے معیارِ قدر کو صحیح ثابت کردیں، تو تمہیں اختیار ہے، چاہے ان قدروں کو قبول کرو جو خالص علم اور عقل پر مبنی ہیں، چاہے اپنی قدروں کے پیچھے پڑے رہو جنہیں مجرد نفسانی رجحان کی بنا پر تم نے پسند کیا ہے۔ مگر اس دوسری صورت میں تمہاری اپنی پوزیشن اس قدر کمزور ہوجائیگی کہ ہمارے طرزِ عمل کی تضحیک کرنے کے بجائے تم خود تضحیک کے مستحق بن کر رہ جاؤ گے۔

دوسرا گروہ | اسکے بعد ہمارے سامنے دوسرا گروہ آتا ہے۔ پہلے گروہ میں تو غیر مسلم اور نام نہاد مسلمان، دونوں قسم کے لوگ شامل ہیں مگر یہ دوسرا گروہ تمام تر مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ان لوگوں میں آجکل نیم حجابی اور نیم بے حجابی کی ایک عجیب معجون مرکب استعمال کی جارہی ہے۔ یہ مذبذبین بین ذٰلک لا الی ھٰؤلاء و لا الی ھٰؤلاء کے صحیح مصداق ہیں۔ ایک طرف تو یہ اپنے اندر اسلامی جذبات رکھتے ہیں۔ اخلاق، تہذیب، شرافت اور حسن سیرت کے ان معیاروں کو مانتے ہیں جنکو اسلام نے پیش کیا ہے اپنی عورتوں کو حیا اور عصمت کے زیوروں سے آراستہ اور اپنے گھروں کو اخلاقی نجاستوں سے پاک رکھنے کے خواہشمند ہیں اور ان نتائج کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں جو مغربی تمدن و معاشرت کے اصولوں کی پیروی سے رونما ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں مگر دوسری طرف اسلامی نظم معاشرت کے اصول و قوانین کو توڑ کر کچھ رکتے، کچھ جھجکتے اُسی راستہ کی طرف اپنی بیویوں، بہنوں، اور بیٹیوں کو لیے چلے جارہے ہیں جو مغربی تہذیب کا راستہ ہے۔ یہ لوگ اس غلط فہمی میں ہیں کہ آدھے مغربی اور آدھے اسلامی طریقوں کو جمع کرکے یہ دونوں تہذیبوں کے فوائد و منافع اکٹھے کر لینگے۔ یعنی انکے گھروں میں اسلامی اخلاق بھی محفوظ رہینگے، انکی خاندانی زندگی کا نظم بھی برقرار رہیگا، اور اسکے ساتھ انکی معاشرت اپنے اندر مغربی معاشرت کی برائیاں نہیں بلکہ صرف اسکی دلفریبیاں، اسکی لذتیں اور اسکی مادی منفعتیں جمع کرے گی۔ لیکن اول تو دو مختلف الاصل اور مختلف المقصد تہذیبوں کی آدھی آدھی شاخیں کاٹ کر پیوند لگانا ہی درست نہیں۔ کیونکہ اس طرح کے بے جوڑ امتزاج سے دونوں کے فوائد جمع ہونے کے بجائے دونوں کے نقصانات جمع ہو جانا زیادہ قریب از قیاس ہے۔ دوسرے یہ بھی خلاف عقل اور خلاف فطرت ہے کہ ایک مرتبہ اسلام کے مضبوط اخلاقی نظام کی بندشیں ڈھیلی کرنے اور نفوس کو قانون شکنی سے لذت آشنا کر دینے کے بعد آپ اس سلسلہ کو اُسی حد پر روک رکھینگے جسکو آپنے خالی از مضرت سمجھ رکھا ہے۔ یہ نیم عریاں لباسوں کا رواج، یہ زینت و آرائش کا شوق، یہ دوستوں کی محفلوں میں بیباکی کے ابتدائی سبق، یہ سینما اور برہنہ تصویروں اور عشقی افسانوں سے بڑھتی ہوئی دلچسپی، یہ مغربی ڈھنگ سے لڑکیوں کی تعلیم، بہت ممکن ہے کہ اپنا فوری اثر نہ دکھائے، بہت ممکن ہے کہ موجودہ نسل اسکی مضرتوں سے محفوظ رہ جائے۔ لیکن یہ سمجھنا کہ آئندہ نسلیں بھی اس سے محفوظ رہیں گی ایک صریح نادانی ہے۔ تمدن اور معاشرت میں ہر غلط طریقہ کی ابتدا بہت معصوم ہوتی ہے، مگر ایک نسل سے دوسری نسل اور دوسری سے تیسری نسل تک پہنچتے پہنچتے وہی چھوٹی سی

ابتدا ایک خوفناک غلطی بن جاتی ہے۔ خود یورپ اور امریکہ میں بھی جن غلط بنیادوں پر معاشرت کی تنظیم جدید کی گئی تھی اسکے نتائج فوراً ظاہر نہیں ہو گئے تھے، بلکہ اس کے پورے پورے نتائج اب تیسری اور چوتھی پشت میں ظاہر ہوئے ہیں۔ پس یہ مغربی اور اسلامی طریقوں کا امتزاج اور یہ نیم بے حجابی دراصل کوئی مستقل اور پائدار چیز نہیں ہے۔ دراصل اسکا فطری رجحان انتہائی مغربیت کی طرف ہے اور جو لوگ اس طریقہ پر چل رہے ہیں انکو سمجھ لینا چاہیے کہ انہوں نے فی الحال اُس سفر کی ابتدا کی ہے جسکی آخری منزلوں تک اگر وہ نہیں تو انکی اولاد اور اولاد کی اولاد پہنچ کر رہیگی۔

فیصلہ کن سوال ایسی حالت میں قدم آگے بڑھانے سے پہلے ان لوگوں کو خوب غور و خوض کر کے ایک بنیادی سوال کا فیصلہ کر لینا چاہیے جو مختصراً حسب ذیل ہے:

کیا آپ مغربی معاشرت کے اُن نتائج کو قبول کرنیکے لیے آمادہ ہیں جو یورپ اور امریکہ میں رونما ہو چکے ہیں، اور جو اس طرزِ معاشرت کے طبعی اور یقینی نتائج ہیں؟ کیا آپ اسکو پسند کرتے ہیں کہ آپکی سوسائٹی میں بھی وہی ہیجان انگیز اور شہوانی ماحول پیدا ہو؟ آپکی قوم میں بھی اسیطرح بے حیائی، بے عصمتی، اور فواحش کی کثرت ہو؟ امراض خبیثہ کی وبائیں پھیلیں؟ خاندان اور گھر کا نظام درہم برہم ہو جائے؟ طلاق اور تفریق کا زور ہو؟ نوجوان مرد اور عورتیں آزاد شہوت رانی کی خوگر ہو جائیں؟ منع حمل اور اسقاط حمل اور قتل اولاد سے نسلیں منقطع کیجائیں؟ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں حدِ اعتدال سے بڑھی ہوئی شہوانیت میں اپنی بہترین عملی قوتوں کو ضائع اور اپنی صحتوں کو برباد کریں؟ حتی کہ کم سن بچوں تک میں قبل از وقت صنفی میلانات پیدا ہونے لگیں اور اس سے انکے دماغی و جسمانی نشوونما میں ابتدا ہی سے فتور برپا ہو جایا کرے؟

اگر مادّی منفعتوں اور حسّی لذتوں کی خاطر آپ ان سب چیزوں کو گوارا کرنے کے لیے تیار ہیں تو بلا تامل مغربی راستے پر تشریف لے جائیے اور اسلام کا نام بھی اپنی زبان پر نہ لائیے۔ اس راستہ پر جانے سے پہلے آپکو اسلام سے قطع تعلق کا اعلان کر نا پڑیگا تاکہ آپ بعد میں اس نام کو استعمال کر کے کسی کو دھوکا نہ دے سکیں، اور آپکی رسوائیاں اسلام اور مسلمانوں کے لیے موجبِ ننگ و عار نہ بن سکیں۔

لیکن اگر آپ ان نتائج کو قبول کرنیکے لیے تیار نہیں ہیں، اگر آپکو ایک ایسے صالح اور پاکیزہ تمدن کی ضرورت ہے جس میں اخلاق فاضلہ اور ملکات شریفہ پرورش پا سکیں جس میں انسان کو اپنی عقلی اور روحانی اور مادّی ترقی کے لیے ایک پرسکون ماحول

ملسکے، جسمیں عورت اور مرد بھی جذبات کی خلل اندازی سے محفوظ رہ کر اپنی بہترین استعداد کے مطابق اپنے اپنے تمدنی فرائض انجام دے سکیں، جسمیں تمدن کا سنگ بنیاد یعنی خاندان پورے استحکام کیساتھ قائم ہو، جسمیں نسلیں محفوظ رہیں اور اختلاط انساب کا فتنہ برپا نہ ہو، جسمیں انسان کی خانگی زندگی اسکے لیے سکون و راحت کی جنت اور اسکی اولاد کے لیے شفقت و تربیت کا گہوارہ اور خاندان کے تمام افراد کے لیے اشتراک عمل اور امداد باہمی کی انجمن ہو، تو ان مقاصد کے لیے آپکو مغربی راستہ کا رخ بھی نہ کرنا چاہیے کیونکہ وہ بالکل مخالف سمت کو جارہا ہے اور مغرب کی طرف چل کر مشرق کو پہنچ جانا عقلاً محال ہے۔ اگر فی الحقیقت آپکے مقاصد یہی ہیں تو آپکو اسلام کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔

مگر اس راستہ پر قدم رکھنے سے پہلے آپکو ان غیر معتدل مادی منفعتوں اور حسی لذتوں کی طلب اپنے دل سے نکالنی ہوگی جو مغربی تمدن کے دلفریب مظاہر کو دیکھکر پیدا ہوگئی ہے۔ اُن نظریات اور تخیلات سے بھی اپنے دماغ کو خالی کرنا ہوگا جو یورپ سے آپنے مستعار رکھی ہیں۔ ان تمام اصولوں اور مقصدوں کو بھی طلاق دینا پڑیگا جو مغربی تمدن و معاشرت سے اخذ کیے گئے ہیں۔ اسلام اپنے الگ اصول اور مقاصد رکھتا ہے اسکے اپنے مستقل عمرانی نظریات ہیں۔ اس نے ویسا ہی ایک نظام معاشرت وضع کیا ہے جیسا کہ اسکے مقاصد اور اسکے اصول اور اسکے عمرانی نظریات کا طبعی اقتضا ہے۔ پھر اس نظام معاشرت کا تحفظ وہ ایک خاص ڈسپلن اور ایک خاص ضابطہ کے ذریعہ سے کرتا ہے جسکے مقرر کرنے میں غایت درجہ کی حکمت اور نفسیات انسانی کی پوری رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے، جسکے بغیر یہ نظام معاشرت اختلال و برہمی سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ یہ افلاطون کی جمہوریت کیطرح کوئی خیالی اور وہمی نظام (Utopia) نہیں ہے، بلکہ ساڑھے تیرہ صدیوں کے زبردست امتحان میں پورا اتر چکا ہے اور اس طویل مدت میں کسی ملک اور کسی قوم کے اندر بھی اسکے اثر سے ان خرابیوں کا عشر عشیر بھی رونما نہیں ہوا ہے جو مغربی تمدن کے اثر سے صرف ایک صدی کے اندر پیدا ہو چکی ہیں۔ پس اگر اس محکم اور آزمودہ نظام معاشرت سے آپ فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو آپکو اسکے ضابطہ اور اسکے ڈسپلن کی پوری پوری پابندی کرنی ہوگی، اور یہ حق آپکو ہرگز حاصل نہ ہوگا کہ اپنی عقل سے نکالی ہوئی یا دوسروں سے سیکھے ہوئے نیم پختہ خیالات اور غیر آزمودہ طریقوں کو، جو اس نظام معاشرت کی طبیعت اور اسکے مزاج کے بالکل خلاف ہوں، خواہ مخواہ اس میں ٹھونسنے کی کوشش کریں۔

تیسرا گروہ چونکہ سفہا اور مغفلین پر مشتمل ہے جن میں خود سوچنے سمجھنے اور رائے قائم کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے لہٰذا وہ کسی توجہ کا مستحق نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ ہم اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھیں۔